تفہیم القرآن

عَبَسَ

(۸۰)

عَبَسَ

نام پہلے ہی لفظ عَبَسَ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول مفسرین و محدثین نے بالاتفاق اِس سُورہ کا سببِ نزول یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مکّۂ معظّمہ کے چند بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضورؐ اُن کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ اتنے میں ابنِ اُمِّ مکتوم نامی ایک نابینا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا۔ حضورؐ کو ان کی یہ مداخلت ناگوار ہوئی اور آپ نے اُن سے بے رُخی برتی۔ اِس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سُورۃ نازل ہوئی۔ اِس تاریخی واقعہ سے اِس سُورہ کا زمانۂ نزول بآسانی متعیّن ہو جاتا ہے۔

اوّلاً یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم بالکل ابتدائی دَور کے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ حافظ ابنِ حَجَر اور حافظ ابن کثیر تصریح کرتے ہیں کہ اَسْلَمَ بِمَکَّۃَ قَدِیْمًا، اور ھُوَ مِمَّنْ اَسْلَمَ قَدِیْمًا، یعنی یہ اُن لوگوں میں سے تھے جو مکّۂ معظّمہ میں بہت پہلے اسلام لائے تھے۔

ثانیاً حدیث کی جن روایات میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اُن میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت وہ اسلام لا چکے تھے اور بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف مائل ہو چکے تھے اور تلاشِ حق میں حضورؐ کے پاس آئے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اُنہوں نے آکر عرض کیا تھا: یارسُولَ اللہ ارشدنی، "یا رسول اللہ، مجھے سیدھا راستہ بتائیے" (ترمذی، حاکم، ابن حبان، ابن جریر، ابویعلیٰ)۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ وہ آکر قرآن کی ایک آیت کا مطلب پوچھنے لگے اور حضورؐ سے عرض کیا یارسُولَ اللہ علّمنی ممّا علّمک اللہ، "یا رسول اللہ مجھے وہ علم سکھائیے جو اللہ نے آپ کو سکھایا ہے" (ابن جریر، ابن ابی حاتم)۔ اِن بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضورؐ کو خدا کا رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کر چکے تھے۔ دوسری طرف ابنِ زید آیت ۳ کے الفاظ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی کا مطلب لَعَلَّہٗ یُسْلِمُ "شاید کہ وہ اسلام قبول کر لے" بیان کرتے ہیں (ابن جریر)۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنا یہ ارشاد بھی کہ "تمہیں کیا خبر، شاید وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اُس کے لیے نافع ہو" اور یہ کہ "جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو" اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے اندر طلبِ حق

کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، وہ حضورؐ ہی کو ہدایت کا منبع سمجھ کر آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ اُن کی یہ طلب یہیں سے پُوری ہو گی، اور یہ بات ان کی حالت سے ظاہر ہو رہی تھی کہ انہیں ہدایت دی جائے تو وہ اس سے مستفید ہوں گے۔

ثالثاً حضورؐ کی مجلس میں جو لوگ اُس وقت بیٹھے تھے، مختلف روایات میں اُن کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔ اِس فہرست میں ہمیں عُتبہ، شَیبہ، ابوجہل، اُمیّہ بن خَلَف، اُبَی بن خلف جیسے بدترین دشمنانِ اسلام کے نام ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِن لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا اور کشمکش اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپ کے ہاں اُن کی آمد و رفت اور آپ کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہو۔ یہ سب امور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ سُورۃ بہت ابتدائی زمانے کی نازل شُدہ سُورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون بظاہر کلام کے آغاز کا اندازِ بیان دیکھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ نابینا سے بے رُخی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرف توجہ کرنے کی بنا پر اِس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن پُوری سُورۃ پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل عتاب کفارِ قریش کے اُن سرداروں پر کیا گیا ہے جو اپنے تکبّر اور ہٹ دھرمی اور صداقت سے بے نیازی کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ حق کو حقارت کے ساتھ رد کر رہے تھے، اور حضورؐ کو تبلیغ کا صحیح طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ اُس طریقے کی غلطی سمجھائی گئی ہے جو اپنی رسالت کے کام کی ابتدا میں آپ اختیار فرما رہے تھے۔ آپ کا ایک نابینا سے بے رُخی برتنا اور سردارانِ قریش کی طرف توجہ کرنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ آپ بڑے لوگوں کو معزز اور ایک بیچارے نابینا کو حقیر سمجھتے تھے، اور معاذ اللہ یہ کوئی کج خُلقی آپ کے اندر پائی جاتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ بلکہ معاملہ کی اصل نوعیت یہ ہے کہ ایک داعی جب اپنی دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اس کا رُجحان اِس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے با اثر لوگ اس کی دعوت قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے، ورنہ عام بے اثر، معذور، یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔ قریب قریب یہی طرزِ عمل ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا تھا جس کا محرّک سراسر اِخلاص اور دعوتِ حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تخیّل۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اِس دعوت کے نقطۂ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالبِ حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر، یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اس لیے آپ اسلام کی تعلیمات تو ہانکے پکارے سب کو سنائیں، مگر آپ کی توجہ کے

اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبولِ حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فروتر ہے کہ آپ اِسے اُن مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ اُن کو آپ کی نہیں بلکہ آپ کو اُن کی ضرورت ہے۔

یہ آغازِ سورۃ سے آیت ۱۶ تک کا مضمون ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۷ سے براہِ راست عتاب کا رُخ ان کفار کی طرف پھر جاتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو رد کر رہے تھے۔ اس میں پہلے اُس رویّے پر اُنہیں ملامت کی گئی ہے جو وہ اپنے خالق و رازق پروردگار کے مقابلے میں برت رہے تھے، اور آخر میں ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز وہ اپنی اس روش کا کیسا ہولناک انجام دیکھنے والے ہیں۔

آیاتہا ۴۲ سُوْرَۃُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓى ۝۱ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝۲ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ

تُرش رُو ہوا اور بے رُخی برتی اِس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آگیا۔[1] تمہیں کیا خبر شاید

[1] اِس پہلے فقرے کا اندازِ بیان عجیب لُطف اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگرچہ بعد کے فقروں میں براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا ہے جس سے یہ بات خود ظاہر ہو جاتی ہے کہ ترش روئی اور بے رُخی برتنے کا یہ فعل حضورؐ ہی سے صادر ہوا تھا، لیکن کلام کی ابتدا اِس طرح کی گئی ہے کہ گویا حضورؐ نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے جس سے اس فعل کا صدور ہوا ہے۔ اِس طرزِ بیان سے ایک نہایت لطیف طریقے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احساس دلایا گیا ہے کہ یہ ایسا کام تھا جو آپ کے کرنے کا نہ تھا۔ آپ کے اخلاقِ عالیہ کو جاننے والا اِسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ یہ آپ نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہے جو اس رویّے کا مرتکب ہو رہا ہے۔

جن نابینا کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد، جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں، مشہور صحابی حضرت ابنِ اُمِّ مکتوم ہیں۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے اَلْاِستیعاب میں اور حافظ ابن حجرؒ نے اَلْاِصابہ میں بیان کیا ہے کہ یہ اُمّ المومنین حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، اِن کی ماں اُمِّ مکتوم اور حضرت خدیجہؓ کے والد خُوَیلِد آپس میں بہن بھائی تھے۔ حضورؐ کے ساتھ ان کا یہ رشتہ معلوم ہو جانے کے بعد اِس شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ نے اُن کو غریب یا کم حیثیت آدمی سمجھ کر ان سے بے رُخی برتی اور بڑے آدمیوں کی طرف توجہ فرمائی تھی، کیونکہ یہ حضورؐ کے اپنے برادرِ نسبتی تھے، خاندانی آدمی تھے، کوئی گرے پڑے آدمی نہ تھے۔ اصل وجہ جس کی بنا پر آپ نے ان کے ساتھ یہ رویّہ اختیار کیا، لفظ اعمیٰ (نابینا) سے معلوم ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی بے اعتنائی کے سبب کی حیثیت سے خود بیان فرما دیا ہے۔ یعنی حضورؐ کا خیال یہ تھا کہ میں اِس وقت جن لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں اُن میں سے کوئی ایک آدمی بھی ہدایت پا لے تو اسلام کی تقویت کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے، بخلاف اس کے ابنِ مکتوم ایک نابینا آدمی ہیں، اپنی معذوری کے باعث یہ اسلام کے لیے اُس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جس قدر اِن سرداروں میں سے کوئی مسلمان ہو کر مفید ہو سکتا ہے، اِس لیے اِن کو اِس موقع پر گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، یہ جو کچھ سمجھنا یا معلوم کرنا چاہتے ہیں اُسے بعد میں کسی وقت بھی دریافت کر سکتے ہیں۔

يَزَّكّٰىٓ ۙ﴿۳﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؕ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ﴿۵﴾
فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ﴿۶﴾ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ
يَسْعٰى ۙ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ﴿۱۰﴾ كَلَّآ اِنَّهَا

وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمّہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دَوڑا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔[۲] ہرگز نہیں،[۳] یہ تو ایک

۲ے یہی ہے وہ اصل نکتہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین کے معاملہ میں اِس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا، اور اسی کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ابن ام مکتومؓ کے ساتھ آپ کے طرزِ عمل پر گرفت فرمائی، پھر آپ کو بتایا کہ داعیِ حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیت کس چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہ ہونی چاہیے۔ ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صاف بتا رہی ہے کہ وہ طالبِ حق ہے، اِس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کر کے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لیے وہ راہِ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کا رویہ صریحاً یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اُسے راہِ راست بتائی جائے۔ اِن دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر کے سُدھرنے کے لیے تیار ہے اور کون اِس متاعِ گراں مایہ کا سرے سے قدر دان ہی نہیں ہے۔ پہلی قسم کا آدمی، خواہ اندھا ہو، لنگڑا ہو، لُولا ہو، فقیر بے نوا ہو، بظاہر دین کے فروغ میں کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو، بہر حال داعیِ حق کے لیے وہی قیمتی آدمی ہے، اُسی کی طرف اُسے توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ اِس دعوت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی اصلاح ہے، اور اُس شخص کا حال یہ بتا رہا ہے کہ اُسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کرے گا۔ رہا دوسری قسم کا آدمی، تو خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بااثر ہو، اُس کے پیچھے پڑنے کی داعیِ حق کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی روش علانیہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ سدھرنا نہیں چاہتا، اس لیے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صرف کرنا وقت کا ضیاع ہے، وہ اگر نہ سُدھرنا چاہے تو نہ سُدھرے، نقصان اس کا اپنا ہوگا، داعیِ حق پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

۳ے یعنی ایسا ہرگز نہ کرو۔ خدا کو بھولے ہوئے اور اپنی دنیوی وجاہت پر پھُولے ہوئے لوگوں کو بے جا اہمیت نہ دو۔ نہ اسلام کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ جو اس سے مُنہ موڑے اُس کے سامنے اِسے بالحاح پیش کیا جائے،

تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ﴿۱۴﴾ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾

نصیحت[۵۴] ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرّم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں[۵۵]، معزز اور نیک کاتبوں[۵۶] کے ہاتھوں میں رہتے ہیں[۵۷]۔

اور نہ تمہاری یہ شان ہے کہ اِن مغرور لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کے لیے کسی ایسے انداز سے کوشش کرو جس سے یہ اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ تمہاری کوئی غرض اِن سے اٹکی ہوئی ہے، یہ مان لیں گے تو تمہاری دعوت فروغ پا سکے گی ورنہ ناکام ہو جائے گی۔ حق اِن سے اُتنا ہی بے نیاز ہے جتنے یہ حق سے بے نیاز ہیں۔

۵۴ مراد ہے قرآن۔

۵۵ یعنی ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہیں۔ ان میں خالص حق کی تعلیم پیش کی گئی ہے۔ کسی نوعیت کے باطل اور فاسد افکار و نظریات اِن میں راہ نہیں پا سکے ہیں۔ جن گندگیوں سے دنیا کی دوسری مذہبی کتابیں آلودہ کر دی گئی ہیں اُن کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی ان کے اندر داخل نہیں ہو سکا ہے۔ انسانی تخیّلات ہوں، یا شیطانی وساوِس، اُن سب سے یہ پاک رکھے گئے ہیں۔

۵۶ اِن سے مراد وہ فرشتے ہیں جو قرآن کے اِن صحیفوں کو اللہ تعالیٰ کی براہِ راست ہدایت کے مطابق لکھ رہے تھے، اُن کی حفاظت کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک انہیں جُوں کا تُوں پہنچا رہے تھے۔ ان کی تعریف میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک کِرام، یعنی مُعزّز۔ دوسرے بَرَرہ، یعنی نیک۔ پہلے لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ اتنے ذی عزّت ہیں کہ جو امانت ان کے سپرد کی گئی ہے اس میں ذرّہ برابر خیانت کا صدور بھی اُن جیسی بلند پایہ ہستیوں سے ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور دوسرا لفظ یہ بتانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ان صحیفوں کو لکھنے، ان کی حفاظت کرنے اور رسول تک ان کو پہنچانے کی جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے اُس کا حق وہ پوری دیانت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

۵۷ جس سلسلۂ بیان میں یہ آیات ارشاد ہوئی ہیں ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ قرآن مجید کی یہ تعریف محض اُس کی عظمت بیان کرنے کے لیے نہیں کی گئی ہے بلکہ اصل مقصود اُن تمام مُتکبّر لوگوں کو، جو حقارت کے ساتھ اِس کی دعوت سے مُنہ موڑ رہے ہیں، صاف صاف جتا دینا ہے کہ یہ عظیم الشان کتاب اِس سے بدرجہا بلند و برتر ہے کہ تمہاری حضوری میں اسے پیش کیا جائے اور تم سے یہ چاہا جائے کہ تم اسے شرفِ قبولیت عطا کرو۔ یہ تمہاری محتاج نہیں ہے بلکہ تم اِس کے محتاج ہو۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو تو جو خنّاس تمہارے دماغ میں بھرا ہوا ہے اسے نکال کر سیدھی طرح اِس کی دعوت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دو۔ ورنہ جس قدر تم اس سے بے نیاز بنتے ہو اُس سے بہت زیادہ یہ تم سے بے نیاز

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝۱۷ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝۱۸
مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝۱۹ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۝۲۰

لعنت۸ ہو انسان۹ پر، کیسا سخت منکرِ حق ہے یہ۱۰۔ کس چیز سے اللہ نے اِسے پیدا کیا ہے؟ نُطفہ کی ایک بُوند سے۱۱۔ اللہ نے اِسے پیدا کیا، پھر اِس کی تقدیر مقرر کی۱۲، پھر اِس کے لیے زندگی کی راہ آسان کی۱۳،

ہے۔ تمہاری تحقیر سے اس کی عظمت میں ذرہ برابر فرق نہ آئے گا، البتہ تمہاری بڑائی کا سارا گھمنڈ خاک میں ملا کر رکھ دیا جائے گا۔

۸ یہاں سے عتاب کا رُخ براہِ راست اُن کفار کی طرف پھرتا ہے جو حق سے بے نیازی برت رہے تھے۔ اِس سے پہلے آغازِ سُورہ سے آیت ۱۶ تک خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور عتاب درپردہ کفار پر فرمایا جارہا تھا۔ اُس کا اندازِ بیان یہ تھا کہ اے نبی، ایک طالبِ حق کو چھوڑ کر آپ یہ کن لوگوں پر اپنی توجہ صرف کر رہے ہیں جو دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے بالکل بے قدر و قیمت ہیں اور جن کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپ جیسا عظیم القدر پیغمبر قرآن جیسی بلند مرتبہ چیز کو ان کے آگے پیش کرے۔

۹ قرآن مجید میں ایسے تمام مقامات پر انسان سے مراد نوعِ انسانی کا ہر فرد نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی ناپسندیدہ صفات کی مذمت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ "انسان" کا لفظ کہیں تو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ نوعِ انسانی کے اکثر افراد میں وہ مذموم صفات پائی جاتی ہیں، اور کہیں اس کے استعمال کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مخصوص لوگوں کو تعیُّن کے ساتھ اگر ملامت کی جائے تو ان میں ضد پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے نصیحت کا یہ طریقہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے کہ عمومی انداز میں بات کہی جائے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ ۶۵۔ الشوریٰ، حاشیہ ۷۵)۔

۱۰ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کس چیز نے اسے کفر پر آمادہ کیا؟" یعنی بالفاظِ دیگر کس بل بوتے پر یہ کفر کرتا ہے؟ کفر سے مراد اس جگہ حق کا انکار بھی ہے، اپنے محسن کے احسانات کی ناشکری بھی، اور اپنے خالق و رازق اور مالک کے مقابلہ میں باغیانہ روش بھی۔

۱۱ یعنی پہلے تو ذرا یہ اپنی حقیقت پر غور کرے کہ کس چیز سے یہ وجود میں آیا؟ کس جگہ اس نے پرورش پائی؟ کس راستے سے یہ دنیا میں آیا؟ اور کس بے بسی کی حالت سے دنیا میں اس کی زندگی کی ابتدا ہوئی؟ اپنی اس اصل کو بھول کر یہ ہمچو ما دیگرے نیست کی غلط فہمی میں کیسے مبتلا ہو جاتا ہے اور کہاں سے اس کے دماغ میں یہ ہوا بھرتی ہے کہ اپنے خالق کے منہ آئے؟ (یہی بات ہے جو سورۂ یٰسٓ، آیات ۷۷-۷۸ میں فرمائی گئی ہے)۔

۱۲ یعنی یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں بن رہا تھا کہ اس کی تقدیر طے کر دی گئی۔ اس کی جنس کیا ہوگی۔ اس کا رنگ

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا

پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔[۱۴] پھر جب چاہے وہ اِسے دوبارہ اُٹھا کھڑا کرے۔[۱۵] ہرگز نہیں، اِس نے

کیا ہوگا۔ اِس کا قد کتنا ہوگا۔ اِس کی جسامت کیسی اور کس قدر ہوگی۔ اس کے اعضاء کس حد تک صحیح و سالم اور کس حد تک ناقص ہوں گے۔ اس کی شکل صورت اور آواز کیسی ہوگی۔ اس کے جسم کی طاقت کتنی ہوگی۔ اس کے ذہن کی صلاحیتیں کیا ہوں گی۔ کس سرزمین، کس خاندان، کن حالات اور کس ماحول میں یہ پیدا ہوگا، پرورش اور تربیت پائے گا اور کیا بن کر اٹھے گا۔ اس کی شخصیت کی تعمیر میں موروثی اثرات، ماحول کے اثرات اور اس کی اپنی خودی کا کیا اور کتنا اثر ہوگا۔ کیا کردار یہ دنیا کی زندگی میں ادا کرے گا، اور کتنا وقت اِسے زمین پر کام کرنے کے لئے دیا جائے گا۔ اِس تقدیر سے یہ بال برابر بھی ہٹ نہیں سکتا، نہ اس میں ذرہ برابر ردّو بدل کر سکتا ہے۔ پھر کیسی عجیب ہے اِس کی یہ جرأت کہ جس خالق کی بنائی ہوئی تقدیر کے آگے یہ اتنا بے بس ہے اُس کے مقابلہ میں کفر کرتا ہے۔

[۱۳] یعنی دنیا میں وہ تمام اسباب و وسائل فراہم کیے جن سے یہ کام لے سکے، ورنہ اِس کے جسم اور ذہن کی ساری قوتیں بے کار ثابت ہوتیں اگر خالق نے اُن کو استعمال کرنے کے لیے زمین پر یہ سروسامان مہیا نہ کر دیا ہوتا اور یہ امکانات پیدا نہ کر دیے ہوتے۔ مزید براں خالق نے اِس کو یہ موقع بھی دے دیا کہ اپنے لیے خیر یا شر، شکر یا کفر، طاعت یا عصیان کی جو راہ بھی یہ اختیار کرنا چاہے کر سکے۔ اُس نے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیے اور ہر راہ اس کے لیے ہموار کر دی کہ جس پر بھی یہ چلنا چاہے چلے۔

[۱۴] یعنی اپنی پیدائش اور اپنی تقدیر کے معاملہ ہی میں نہیں بلکہ اپنی موت کے معاملہ میں بھی یہ اپنے خالق کے آگے بالکل بے بس ہے۔ نہ اپنے اختیار سے پیدا ہو سکتا ہے، نہ اپنے اختیار سے مر سکتا ہے، اور نہ اپنی موت کو ایک لمحہ کے لیے بھی ٹال سکتا ہے۔ جس وقت، جہاں، جس حال میں بھی اِس کی موت کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اُسی وقت، اُسی جگہ اور اُسی حال میں یہ مر کر رہتا ہے، اور جس نوعیت کی قبر بھی اس کے لیے طے کر دی گئی ہے اُسی نوعیت کی قبر میں ودیعت ہو جاتا ہے، خواہ وہ زمین کا پیٹ ہو، یا سمندر کی گہرائیاں، یا آگ کا الاؤ، یا کسی درندے کا معدہ۔ انسان خود تو درکنار، ساری دنیا مل کر بھی اگر چاہے تو کسی شخص کے معاملہ میں خالق کے اِس فیصلے کو بدل نہیں سکتی۔

[۱۵] یعنی اِس کی یہ مجال بھی نہیں ہے کہ خالق جب اِسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا چاہے تو یہ اٹھنے سے انکار کر سکے۔ پہلے جب اِسے پیدا کیا گیا تھا تو اس سے پوچھ کر پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ اِس سے رائے نہیں لی گئی تھی کہ تو پیدا ہونا چاہتا ہے یا نہیں۔ یہ انکار بھی کر دیتا تو پیدا ہو کر رہتا۔ اِسی طرح اب دوبارہ پیدائش بھی اِس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے کہ یہ مر کر اٹھنا چاہے تو اُٹھے اور اُٹھنے سے انکار کر دے تو نہ اُٹھے۔ خالق کی مرضی کے آگے اِس معاملہ میں بھی یہ قطعی بے بس ہے۔ جب بھی وہ چاہے گا اِسے اُٹھا کھڑا کرے گا اور اِس کو اٹھنا ہوگا، خواہ یہ راضی ہو یا نہ ہو۔

يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿٢٣﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿٢٤﴾ اَنَّا صَبَبْنَا
الْمَآءَ صَبًّا ﴿٢٥﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿٢٦﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿٢٧﴾
وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿٢٨﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿٢٩﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿٣٠﴾
وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿٣١﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٢﴾

وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اِسے حکم دیا تھا۔[16] پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔[17] ہم نے خوب پانی لُنڈھایا،[18] پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا،[19] پھر اُس کے اندر اگائے غلّے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامانِ زیست کے طور پر۔[20]

---

۱۶ حکم سے مراد وہ حکم بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فطری ہدایت کی صورت میں ہر انسان کے اندر ودیعت کر دیا ہے، وہ حکم بھی جس کی طرف انسان کا اپنا وجود اور زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ہر ذرّہ اور قدرتِ الٰہی کا ہر مظہر اشارہ کر رہا ہے، اور وہ حکم بھی جو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے بھیجا اور ہر دَور کے صالحین کے ذریعہ سے پھیلایا ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، تفسیر سُورۂ دہر، حاشیہ ۵)۔ اِس سلسلۂ بیان میں یہ بات اِس معنی میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جو حقائق اوپر کی آیتوں میں بیان ہوئے ہیں اُن کی بنا پر فرض تو یہ تھا کہ انسان اپنے خالق کی فرمانبرداری کرتا، مگر اس نے اُلٹی نافرمانی کی راہ اختیار کی اور بندۂ مخلوق ہونے کا جو تقاضا تھا اسے پُورا نہ کیا۔

۱۷ یعنی جس خوراک کو وہ ایک معمولی چیز سمجھتا ہے، اُس پر ذرا غور تو کرے کہ یہ آخر پیدا کیسے ہوتی ہے۔ اگر خدا نے اِس کے اسباب فراہم نہ کیے ہوتے تو کیا انسان کے بس میں یہ تھا کہ زمین پر یہ غذا وہ خود پیدا کر لیتا؟

۱۸ اِس سے مُراد بارش ہے۔ سُورج کی حرارت سے بے حد و حساب مقدار میں سمندروں سے پانی بھاپ بنا کر اٹھایا جاتا ہے، پھر اس سے کثیف بادل بنتے ہیں، پھر ہوائیں ان کو لے کر دنیا کے مختلف حصّوں میں پھیلاتی ہیں، پھر عالمِ بالا کی ٹھنڈک سے وہ بھاپیں از سرِ نو پانی کی شکل اختیار کرتی اور ہر علاقے میں ایک خاص حساب سے برستی ہیں، پھر وہ پانی براہِ راست بھی زمین پر برستا ہے، زیرِ زمین کنوؤں اور چشموں کی شکل بھی اختیار کرتا ہے، دریاؤں اور ندی نالوں کی شکل میں بھی بہتا ہے، اور پہاڑوں پر برف کی شکل میں جم کر پھر پگھلتا ہے اور بارش کے موسم کے سوا دوسرے موسموں میں بھی دریاؤں کے اندر رواں ہوتا ہے۔ کیا یہ سارے انتظامات انسان نے خود کیے ہیں؟ اُس کا خالق اُس

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَ
اُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ

آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی[۲۱] ـــــ اُس روز آدمی اپنے بھائی
اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا[۲۲]۔ ان میں سے ہر شخص پر

کی رزق رسانی کے لیے یہ انتظام نہ کرتا تو کیا انسان زمین پر جی سکتا تھا؟

۱۹؎ زمین کو پھاڑنے سے مراد اُس کو اس طرح پھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گٹھلیاں یا نباتات کی بیریاں انسان اُس کے اندر بوئے، یا جو ہواؤں اور پرندوں کے ذریعہ سے، یا کسی اور طریقے سے اُس کے اندر پہنچ جائیں، وہ کونپلیں نکال سکیں۔ انسان اِس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ زمین کو کھودتا ہے یا اس میں ہل چلاتا ہے، اور جو تخم خدا نے پیدا کر دیے ہیں، انہیں زمین کے اندر اُتار دیتا ہے۔ اس کے سوا سب کچھ خدا کا کام ہے۔ اُسی نے بے شمار اقسام کی نباتات کے تخم پیدا کیے ہیں۔ اُسی نے اِن تخموں میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ زمین میں پہنچ کر وہ پھوٹیں اور ہر تخم سے اُسی کی جنس کی نباتات اُگے۔ اور اُسی نے زمین میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کر وہ ان تخموں کو کھولے اور ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کے مناسب حال غذا بہم پہنچا کر اسے نشو و نما دے۔ یہ تخم اِن خاصیتوں کے ساتھ، اور زمین کی یہ بالائی تہیں اِن صلاحیتوں کے ساتھ خدا نے پیدا نہ کی ہوتیں تو کیا انسان کوئی غذا بھی یہاں پا سکتا تھا؟

۲۰؎ یعنی تمہارے ہی لیے نہیں بلکہ اُن جانوروں کے لیے بھی جن سے تم کو گوشت، چربی، دودھ، مکھن وغیرہ سامانِ خوراک حاصل ہوتا ہے اور جو تمہاری معیشت کے لیے بے شمار دوسری خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اسی لیے ہے کہ تم اِس سرو سامان سے متمتّع ہو اور جس خدا کے رزق پر پل رہے ہو اُسی سے کفر کرو؟

۲۱؎ مراد ہے آخری نفخِ صور کی قیامت خیز آواز جس کے بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان جی اٹھیں گے۔

۲۲؎ اِس سے ملتا جلتا مضمون سُورۂ معارج آیات ۱۰ تا ۱۴ میں گزر چکا ہے۔ بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اِن عزیزوں کو، جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ پیارے تھے، مصیبت میں مبتلا دیکھ کر بجائے اِس کے کہ اُن کی مدد کو دوڑے، اُلٹا ان سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اسے مدد کے لیے پکار نہ بیٹھیں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر جس طرح یہ سب ایک دوسرے کی خاطر گناہ اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اُس کے بُرے نتائج سامنے آتے دیکھ کر ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہ گاریوں کی ذمہ داری اُس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی

يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ
مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾
أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

ع ۱ ۴۲ ۵

اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔[۲۳] کچھ چہرے اُس روز دمک رہے ہوں گے ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اُڑ رہی ہوگی اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے۔

سے، اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے خلاف مقدمے کے گواہ بننے والے ہیں۔

۲۳ احادیث میں مختلف طریقوں اور سندوں سے یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے روز سب لوگ ننگے نپچے اٹھیں گے"۔ آپ کی ازواج مطہرات میں سے کسی نے (بروایت بعض حضرت عائشہؓ نے، اور بروایت بعض حضرت سودہؓ نے اور بروایت بعض ایک خاتون نے) گھبرا کر پوچھا، یا رسول اللہ کیا ہمارے ستر اُس روز سب کے سامنے کھلے ہوں گے؟ حضورؐ نے یہی آیت تلاوت فرما کر بتایا کہ اُس روز کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ ہوگا (نسائی، ترمذی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، طبرانی، ابن مردویہ، بیہقی، حاکم)۔